دعوتِ الی اللہ

ڈاکٹر اسرار احمد

مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور

دعوت اِلَی اللہ

کی ضرورت و اہمیّت
اور اس کے
اُصول و مَبادِی

ایک تقریر جو یکم اکتوبر ۱۹۶۷ء کو جامعہ محمدّیہ
ملتان کے سالانہ اجتماع میں کی گئی!!

ڈاکٹر اسرار احمد

مکتبہ مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور رجسٹرڈ
۳۶-کے ماڈل ٹاؤن لاہور — فون ۳ — ۵۸۶۹۵۰۱

نام کتاب ——— دعوت الی اللہ

بارِ اوّل تا بارِ نہم (مارچ ۷۵ء تا ۹۶ء) ——— ۲۰۴۰۰

بارِ دہم (جنوری ۲۰۰۳ء) ——— ۲۲۰۰

ناشر ——— ناظم نشر و اشاعت، مرکزی انجمن خدام القرآن، لاہور

مقامِ اشاعت ——— ۳۶۔ کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور

فون: ۳۔۵۸۶۹۵۰۱

مطبع ——— شرکت پرنٹنگ پریس، لاہور

قیمت ——— ۸ روپے

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

حمد وثنا کے بعد آیہ کریمہ "وَمَنۡ اَحۡسَنُ قَوۡلًا مِّمَّنۡ دَعَاۤ اِلَی اللّٰہِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِیۡ مِنَ الۡمُسۡلِمِیۡنَ" تلاوت کی گئی اور عرض کیا گیا:

بزرگو اور بھائیو!

حقیقت یہ ہے کہ میرا یہ مقام ہرگز نہ تھا کہ میں ایسے عظیم الشان دینی اجتماع سے خطاب کرتا، تاہم جب آپ حضرات کا حکم ہے تو میں کچھ معروضات پیش خدمت کرتا ہوں۔ اور اب جبکہ آپ حضرات سے ہم کلام ہونے کا ایک موقع مل ہی گیا ہے تو کوشش کرتا ہوں کہ ایسی بات آپ کے گوش گزار کروں جو حقیقۃً مفید ہو اور جس سے کم از کم ان لوگوں کو ضرور فائدہ پہنچے جو "اَلۡقَی السَّمۡعَ وَھُوَ شَھِیۡدٌ" کی کیفیت کے ساتھ ان گزارشات کو سنیں، اس لیے کہ ایسے ہی لوگوں کے بارے میں امید کی جاسکتی ہے کہ ؎

شاید کہ اتر جائے ترے دل میں میری بات

میں نے اپنی گزارشات کا عنوان قرآن حکیم کی اس آیت کو بنایا ہے "وَمَنۡ اَحۡسَنُ قَوۡلًا مِّمَّنۡ دَعَاۤ اِلَی اللّٰہِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِیۡ مِنَ الۡمُسۡلِمِیۡنَ" یعنی "اس شخص سے بہتر بات اور کس کی ہو سکتی ہے جو اللہ کی طرف بلائے اور نیک عمل کرے اور یہ کہے کہ میں مسلمانوں میں سے ہوں"! یعنی میری آج کی گزارشات کا موضوع ہے "دعوت الی اللہ" اس موضوع کا انتخاب میں نے دو وجوہات کی بنا پر کیا ہے:

امت کا فرضِ منصبی

ایک یہ کہ میں اور آپ جس امت کے افراد ہیں، اس کا مقصدِ وجود اور غرضِ تاسیس ہی "دعوت الی اللہ" ہے اور دنیا میں ہماری عزت اور سربلندی ہی نہیں ہمارے وجود اور بقا کا انحصار

بھی اسی بات پر ہے کہ ہم اپنے اس فرضِ منصبی کو کما حقہٗ ادا کریں۔ سورۃ البقرہ کے سترھویں رکوع میں تحویلِ قبلہ کے حکم کے ساتھ ہی یہ آیت وارد ہوئی ہے کہ: وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا "ہم نے تمہیں ایک امّتِ وسط اس لیے بنایا ہے کہ تم لوگوں پر گواہ ہو اور یہ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) تم پر گواہ ہوں" تحویلِ قبلہ کا حکم دراصل علامت (symbol) تھی اس امر کی کہ اب متولیانِ مسجدِ اقصیٰ یعنی بنو اسرائیل سے ہدایتِ خداوندی کی امانت داری و علمبرداری کا منصب سلب کر لیا گیا اور متولیانِ مسجدِ حرام یعنی بنو اسمٰعیل اس منصب پر فائز کر دیئے گئے۔ ظاہر ہے کہ اُمّتِ مسلمہ کا اصل مرکز اور قلب (nucleus) ہونے کی حیثیت بنو اسمٰعیل ہی کو حاصل ہے، ان ہی کی زبان خدا کی کتاب کی حامل بنی اور ان ہی کے رسوم و رواج سے قطع و برید اور حذف و اضافے کے ساتھ خدا کی آخری شریعت کا تانا بانا تیار ہوا۔ "اٰخَرِيْنَ" یعنی وہ دوسری اقوام جو بعد میں اس اُمّت میں شامل ہوتی چلی گئیں، معنوی اعتبار سے یقیناً "مِنْهُمْ" یعنی ان ہی میں سے ہیں، اور یہ بھی اللہ کا بڑا ہی فضل ہے جو ان پر ہوا لیکن یہ شرف "اُمِّيّٖن" ہی کو حاصل ہوا کہ خدا کے آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ان ہی میں اور ان ہی میں سے ہوتی[1]

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا!
ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں!

اس اُمّت کی وجہِ تشکیل اور غرضِ تاسیس سورۃ آل عمران میں ان الفاظ میں بیان ہوئی کہ:

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ "تم وہ بہترین اُمّت ہو جسے نوعِ انسانی کے لیے برپا کیا گیا ہے، تم حکم دیتے ہو نیکی کا اور روکتے ہو بدی سے اور ایمان رکھتے ہو خدا پر"۔ گویا دنیا کی دوسری تمام اقوام و امم اپنے لیے جیتی ہیں اور ان کا مطمعِ نظر اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا کہ ان کا بول بالا اور عظمت دوبالا ہو اور وہ آدم کی زیادہ سے

---

[1] اشارہ ہے سورۃ الجمعہ کی آیات ۲ تا ۴ کی جانب!

زیادہ اولاد کو، بس پڑے تو عسکری و سیاسی ورنہ کم از کم معاشی و تہذیبی تسلّط کے شکنجے میں گرفتار کر کے اپنے تابع رکھ سکیں لیکن اس اُمّت کا جینا اس لیے ہے کہ دُنیا میں اللہ کا نام رہے[1]، اس کا کلمہ بلند ہو، حق کا بول بالا ہو، نیکیاں عام ہوں اور اچھائیاں پروان چڑھیں، اور بدیاں ختم ہوں اور برائیوں کا استیصال ہو جائے۔ یعنی یہ اُمّت دراصل دنیا میں خدا کی نمائندہ، خیر کا ذریعۂ آلہ (instrument) اور شر اور باطل کے استیصال کا ادارہ (institution) ہے۔

جب تک یہ اپنے اس فرضِ منصبی کو ادا کرتی رہی، اس کا اپنا بول بھی بالا رہا اور حق کے ساتھ یہ بھی سربلند رہی۔ لیکن جب اس نے اپنے مقصدِ وجود کو بھلا دیا اور یہ بھی بس دنیا کی دوسری قوموں کی طرح ایک قوم بن کر رہ گئی تو اس پر بھی اسی طرح عتابِ خداوندی نازل ہوا جس طرح اس سے پہلے بنی اسرائیل پر ہوا تھا۔ اوّل اوّل معاملہ صرف "وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ"[2] تک محدود رہا اور عالمِ اسلام کی سیادت بنی اسمٰعیل یعنی عربوں سے چھین کر کُردوں اور سلجوقیوں کو عطا کر دی گئی۔ اس پر بھی آنکھیں نہ کھلیں تو فتنۂ تاتار کی صورت میں قہرِ خداوندی کا "وعدۂ اولیٰ" نازل ہوا اور "بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَا اُولِىْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ فَجَاسُوْا خِلٰلَ الدِّيَارِ" کا ہو بہو نقشہ کھچ گیا۔ تاریخ حیران کہ اہلِ ہند فتنۂ تاتار کا انتظار ہی کیوں کرتے رہ گئے اور کیوں ان کا رُخ تیر کی مانند سیدھا بغداد کی طرف رہا۔ لوگ بھول جاتے ہیں کہ اس اُمّت کا مرکز بنو اسمٰعیل تھے اور اس کا قلب بغداد تھا اور اصل گوشمالی ان کی مطلوب تھی۔ تاریخ شاہد ہے کہ اس کے بعد مسلمانوں میں سے جو قومیں ابھریں، وہ بنی اسمٰعیل میں سے نہ تھیں، "آخرین" میں سے تھیں یعنی ہند میں مغل اور ایشیائے کوچک میں ترک جو بالآخر خلافتِ اسلامی کے بھی وارث ہوئے۔ اس طرح بنو اسمٰعیل کی مذہبی و دینی سیادت کا آخری امتیازی نشان بھی مٹ گیا۔ ان کی حیثیت ترکوں کے محکوموں اور باج گزاروں سے زیادہ کچھ نہ رہی۔ یہ تو اس صدی کے واقعات ہیں کہ اس کے

---

[1] ع "ہم تو جیتے ہیں کہ دنیا میں ترا نام رہے"۔ اقبال

[2] سورۂ محمد: "اگر تم پھر جاؤ گے تو وہ تمہاری جگہ کسی دوسری قوم کو اسی مقام پر فائز کر دے گا"۔

اوائل میں وہ ترکوں کی غلامی سے نکل کر پہلے یورپی تسلّط کے تحت آئے اور پھر صدی کے وسط کے لگ بھگ آہستہ آہستہ اس سے بھی نجات پائی اور آزادی کا سانس لیا۔ اس کے بعد کی رُبع صدی اس داستان کا المناک ترین باب ہے کہ آزاد ہو کر بھی جب انہوں نے دین سے بے رُخی اختیار کی، تعیّش و تنعّم کی زندگی کو اختیار کیا اور مغربی تہذیب کے ظاہر سے متأثر ہو کر عیّاشی اور فکری و عملی آوارگی کو شعار بنایا، ملّتِ اسلامی کی بجائے نسلی و وطنی عصبیتوں کو ابھارا، شریعت کو پس پشت ڈالا اور مذہب کے نام لیواؤں پر مظالم ڈھائے تو بالآخر کم از کم بنی اسمٰعیل کی حد تک تو "وَعْدُ الْاٰخِرَةِ" بھی آکر رہا اور اللہ نے اپنی ایک علی الاعلان (proclaimed) مغضوب قوم کے ہاتھوں انہیں ایسی ذلّت آمیز شکست دی کہ رہے نام اللہ کا![1]

حالیہ عرب اسرائیل جنگ سے ذلیل و خوار تو پوری ملّتِ اسلامی ہوئی اور یہ داغِ رسوائی لازماً سارے ہی مسلمانوں کے حصّے میں آیا، لیکن اس میں "اَلَّذِیْ تَوَلّٰی کِبْرَہٗ" کا مصداق بہرحال عرب ہی ہیں۔ دینی پستی اور مذہب سے بُعد یقیناً اس وقت پوری اُمّتِ مسلمہ ہی کا حال ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس معاملے میں مصر، شام اور لبنان کی بدمستیاں دوسرے مسلمانوں سے کئی ہاتھ آگے ہیں۔ تو پھر کون سے تعجب کی بات ہے اگر ذلّت و رسوائی میں سے بھی سب سے بڑا حصّہ انہی نے پایا۔ ویسے بھی جب عزّت و فضیلت اور شرف میں مقدّم تھے تو منطقی

---

[1] راقم الحروف نے جولائی ۱۹۶۷ء کے "میثاق" میں سیاہ حاشیے میں لکھا تھا: "گزشتہ ماہ اسرائیل کے ہاتھوں مسلمانانِ عرب کو جو ذلّت آمیز شکست اٹھانی پڑی اور جس پر پوری دنیا کے مسلمانوں نے اپنے دلوں میں درد کی شدید ٹیسیں محسوس کیں، پھر نام نہاد اقوامِ متحدہ نے اس معاملے میں سرد مہری ہی نہیں باقاعدہ اسرائیل نوازی کا جو رویّہ اختیار کیا اس سے کم از کم مسلمانانِ عرب کے لیے تو ایک بار "ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ" کی وہی کیفیت پیدا ہو گئی جس میں کئی ہزار سال تک بنی اسرائیل مبتلا رہے ہیں!" اس وقت یہ اندازہ ہو سکتا تھا کہ صرف چار ساڑھے چار سال بعد ہی سقوطِ مشرقی پاکستان کی صورت میں عذابِ خداوندی کا ایک کوڑا "آخرین" کے ایک اہم حصّے کی پیٹھ پر پڑنے والا ہے!

طور پر ذلت و رسوائی کا بھی حصّہ اولیٰ انہی کا ہونا چاہیے۔

قصّہ طول کھینچ گیا۔ عرض صرف اس قدر کرنا تھا کہ اس اُمت کی غرضِ تاسیس دعوت الیٰ اللہ ہے اور اس پر نہ صرف یہ کہ اس کی عزت و عظمت کا انحصار بلکہ وجود و بقا کا دار و مدار بھی ہے اور "اُمیّین" اور "اٰخرین" دونوں کے لیے ایک ہی راہ ہے کہ "عَسٰی رَبُّکُمْ اَنْ یَّرْحَمَکُمْ" کی نوید جانفزا سے گرتے ہوئے حوصلوں کو از سرِ نو استوار اور ٹوٹتی ہوتی اُمیدوں کو نئے سرے سے قائم کریں اور "وَاِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا"[1] کی وعید سے لرزاں و ترساں ہو کر اپنے فرضِ منصبی کی ادائیگی کے لیے اُٹھ کھڑے ہوں۔ اللہ تعالیٰ کی جانب سے پے در پے تنبیہات اسی لیے ہیں کہ ہم جان لیں کہ ہمارے لیے "فَفِرُّوْٓا اِلَی اللّٰہِ" کے سوا کوئی راہ نہیں ہے اور اپنی عظمت و سطوتِ پارینہ کی بازیافت ہی نہیں بلکہ اپنے وجود و بقا کی ضمانت کے لیے بھی کوئی لائحہ عمل "دعوت الی اللہ" کے سوا موجود نہیں ہے۔!

رسول ﷺ اللہ کی مؤکد ترین سُنّت

دوسرا سبب آج کے اس اجتماع میں اس موضوع پر گفتگو کا یہ ہے کہ یہ ایسے لوگوں کا اجتماع ہے جو سنّتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شیدائی ہیں اور جن کا مسلک و مشرب ہی یہ ہے کہ جو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا بس وہی کرنا چاہیئے۔ مبارک ہیں آپ لوگ اگر واقعتہً آپ کے دلوں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّت کے اتباع کا جذبہ موجود ہے۔ لیکن افسوس کہ آپ کو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بہت سی دوسری سُنّتیں تو یاد ہیں اور ان پر آپ عمل بھی پوری شدّت کے ساتھ کرتے ہیں بلکہ ان کی وجہ سے آپ دوسروں سے جنگ و جدل سے بھی نہیں چوکتے۔ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے بڑی سُنّت، جس سے زیادہ مؤکد سُنّت اور کوئی نہیں جس پر آپؐ کا تواترِ عمل ظاہر و باہر، جس پر آپؐ اپنی بعثت کی پہلی ساعت سے حیاتِ

---

[1] دیکھئے سورۃ بنی اسرائیل کی آیات ۴ تا ۸۔

دنیوی کی آخری گھڑی تک ہر لحظہ و ہر آن عمل پیرا رہے' اسے آپ نے نہ صرف یہ کہ عملاً ترک کر دیا ہے، بلکہ بھلا بھی دیا ہے۔ میری مراد "سُنّتِ دعوت" سے ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ دعوت و تبلیغ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مؤکد ترین سُنّت نہیں ہے ؟ کون کہہ سکتا ہے کہ زندگی بھر حضورؐ کو دعوت و تبلیغ سے زیادہ کسی بات کا دھیان یا دھن رہی ؟ اب اگر سُنّت نام ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے اور طرزِ عمل کا، تو خدارا سوچیے کہ آنحضورؐ کی سب سے بڑی سُنّت کون سی ہے "بَلِّغُوا عَنِّي" کے تاکیدی حکم پر غور کیجیے کہ اس کو "وَلَوْ آيَةً" [1] کے ذریعے کس قدر عمومیت دے دی گئی ہے۔ رفع یدین جس کے بارے میں آپ بہت جھگڑتے ہیں، کون ہے جو یقین کے ساتھ کہہ سکے کہ اس پر آپؐ عمر بھر عمل پیرا رہے! آمین بالجہر کے بارے میں کون ہے جو یہ دعوٰی کر سکے کہ اس پر آپؐ نے از اوّل تا آخر مداومت کی ؟ برعکس اس کے "دعوت و تبلیغ" وہ سُنّتِ مؤکدہ ہے جس پر آپؐ ۲۳ سال کی پوری مدّت کے دوران مسلسل عمل پیرا رہے گویا دعوتِ اِلَی اللہ ایک طرف تو از روئے قرآن اُمّتِ مسلمہ کا مقصدِ وجود اور فرضِ منصبی ہے اور دوسری طرف ہمارے محبوب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی مؤکد ترین سُنّت ہے۔ لہٰذا اسی موضوع پر میں آپ سے چند باتیں کروں گا۔!

دعوت الی اللہ کے مراحل و مدارج

'دعوتِ دین'، یا دعوت الی اللہ، کوئی مفرد یا بسیط عمل نہیں ہے بلکہ اس کے متعدد پہلو اور بے شمار مراتب و مدارج ہیں۔ یہ ایک فرد کی اپنی ذات اور اس کے اہل و عیال (قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا) سے ہو کر، اس کے کنبے قبیلے (وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ) پھر قوم (يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ) اور بالآخر پوری نوعِ انسانی (لِتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ) تک پہنچتی ہے۔ اس کی ابتدا محض خبردار کرنے اور "ڈر سنا دینے" (يٰٓاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝ قُمْ فَاَنْذِرْ) سے ہوتی ہے لیکن اس کا منتہائے مقصود یہ ہوتا ہے کہ خالقِ کائنات کی کبریائی کا اعلان و

---

[1] حدیث نبویؐ "میری جانب سے پہنچاؤ، چاہے ایک ہی آیت!"

اظہار ہو (وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ) حسبِ استعداد و مذاقِ مخاطبین اسے بلند پایہ علمی و عقلی استدلال کے ساتھ بھی پیش کیا جانا چاہیے (اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ) اور مؤثر و دلنشیں وعظ و نصیحت (وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ) کے ذریعے بھی۔ پھر کٹ حجتوں اور ہٹ دھرم لوگوں کے مقابلے میں بحث و جدال کی بھی ضرورت پڑ سکتی ہے (وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ) اور وقت آنے پر جہاد و قتال بھی اِسی دعوتِ الٰہی کی بلند ترین منازل قرار پاتے ہیں (وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰی لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّیَكُوْنَ الدِّیْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ) تاکہ اللہ کا کلمہ سربلند ہو، اسی کا حکم چلے اور لوگ عدل و قسط پر قائم ہوں (لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ)

آج کی اس گفتگو میں میں دعوت الی اللہ کے ان بلند تر مراتب سے بحث نہیں کرنا چاہتا جن کے لیے اجتماعی جدوجہد لازمی ہے یعنی ایک تو تمام بنی آدم پر خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوّت و رسالت کی جانب سے اتمامِ حجّت کا وہ فریضہ میری آج کی گفتگو کے دائرے سے خارج ہے جو آپؐ کی اُمّت پر بحیثیت مجموعی عائد ہوتا ہے اور دوسرے خود اس اُمّت کی اجتماعی اصلاح کا وہ کام بھی میری آج کی گفتگو کا براہِ راست موضوع نہیں ہے جو بجائے خود ایک منظم اجتماعی جدوجہد کا متقاضی ہے۔ اس کے برعکس آج میں "دعوت الی اللہ" کی ان ابتدائی اور بنیادی منزلوں کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں جن تک ہر مسلمان کی رسائی ممکن بھی ہے اور لازم بھی!

سُنّتِ رسُولؐ کا تمسخر

اِس سے پہلے میں اس استہزا کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں جو ہمارے معاشرے میں تبلیغ کے مقدّس اور عظیم الشّان فریضے کے ساتھ کیا جا رہا ہے۔ آپ جانتے ہیں ہر مذہبی فرقے نے "مبلغین" کی ایک سول سروس جاری کی ہوتی ہے اور اس کے تحت تنخواہ دار مبلّغ بعض اختلافی مسائل پر مناظرانہ انداز کی تقریریں دیہات و قصبات میں کرتے پھرتے ہیں جس سے اس کے سوا اور کچھ حاصل نہیں ہوتا کہ ان کے ہم مسلک و ہم مشرب لوگوں پر وقتی طور پر ایک سرور کی سی کیفیت

طاری ہو جاتی ہے کہ واقعتہً ہم ہی حق پر ہیں اور ہمارا ہی مسلک صحیح تر ہے! ایسے مبلغین کی اکثریت کو تو اس کی سرے سے جرأت ہی نہیں ہوتی کہ اپنے سامعین کو براہِ راست خطاب کر کے یہ کہہ سکیں کہ تمہارے اندر یہ خرابیاں ہیں انہیں دُور کرو، سودی کاروبار نہ کرو، غلط حسابات نہ رکھو، رشوت نہ لو، اسراف نہ کرو۔[1] بعض واعظین اگر برائے بیت ایسی کوئی بات کہہ بھی دیں تو اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا اس لیے کہ جس اجتماع میں وہ تقریر کر رہے ہوتے ہیں اس کا اہتمام ان تمام غلط کاموں کی آمدنی سے ہوتا ہے! سامعین کی اکثریت تھوڑی دیر کے لیے اپنے مقررین کی اس حق گوئی سے بھی لذّت اندوز ہو لیتی ہے۔ رہے میاں حضرات اور چوہدری صاحبان تو وہ زیرِ لب مسکرا کر اس وقت تو ایک خاموش مگر تلخ طنز پر اکتفا کر لیتے ہیں مگر بعد میں اپنی نجی گفتگوؤں میں اپنے مذہبی پیشواؤں کی گھریلو و نجی خامیوں اور کوتاہیوں کا اہانت آمیز تذکرہ کر کے بدلہ چکا لیتے ہیں اور اس پورے سلسلے کا نام ہے تبلیغِ دین!

حضرات! میں پورے سوز اور درد کے ساتھ یہ سوچنے کی دعوت دیتا ہوں کہ کیا یہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے زیادہ متواتر اور مؤکد سُنّت کے ساتھ استہزاء اور تمسخر نہیں ہے؟ اور کیا اس طرح نادانستہ طور پر ہم خود آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین و تحقیر کے مرتکب نہیں ہو رہے ہیں؟ منبرِ رسول ؐ پر کھڑے ہونے والوں کی ہمارے اس معاشرے میں جو قدر و منزلت اور عزّت و وقعت ہے، قطعِ نظر اس سے کہ اس کا اصل سبب خود وہ ہیں یا دوسرے، اس سے کیا بالواسطہ خود اس محترم ہستی صلی اللہ علیہ وسلم کی تحقیر نہیں ہوتی جس سے منبر منسوب ہے۔ خدا کے لیے اپنے طرزِ عمل پر نظرِ ثانی فرمائیں! تنخواہ پر کام کرنا حرام نہیں۔ لیکن واضح رہنا چاہیے کہ معاوضے پر کام کرنے والا مدرّس و معلّم ہو سکتا ہے داعی و مبلّغ ہرگز نہیں ہو سکتا۔ اس راہ کی تو سب

---

[1] واضح رہے کہ از روئے قرآن علماء و صلحاءِ اُمّتِ مسلمہ کا فرضِ منصبی وہ ہے جس کی جانب اس آیت کریمہ میں اشارہ ہوا کہ لَوْلَا يَنْهٰهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ (کیوں نہیں روکتے انہیں ان کے درویش اور علماء گناہ کی بات کہنے اور حرام کھانے سے؟)

سے پہلی شرط یہ ہے کہ ہر طرح کے مفادات و اغراض سے بالکل پاک ہو کر خالص نصح و خیر خواہی کے جذبے سے اور اس اعلان کے ساتھ کام کیا جائے کہ وَمَآ اَسۡـَٔلُکُمۡ عَلَیۡہِ مِنۡ اَجۡرٍ، اِنۡ اَجۡرِیَ اِلَّا عَلٰی رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ۝[1]

احیائے سُنّت کا اجر و ثواب

آپ حضرات نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث بہت مرتبہ سنی ہو گی کہ جس نے میری کسی ایسی ایک سنّت کو زندہ کیا جس پر عمل متروک ہو چکا ہو تو اس کو سو شہیدوں کا اجر و ثواب ملے گا۔ مَیں آج آپ کو اس بات کی دعوت دیتا ہوں کہ آپ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّتِ دعوت کو زندہ کریں اور اس کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ آپ میں سے ہر شخص یہ فیصلہ کرے کہ آج سے میں "دین کا داعی" اللہ کی طرف پکارنے والا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّتِ دعوت کا ادنیٰ متبع ہوں۔!

دعوت الی اللہ کی اصل شرط: اللہ کی ربوبیّت پر اعتماد

اس بات کو بالکل دل سے نکال دیں کہ دین کی دعوت کے لیے دین کے کسی لمبے چوڑے علم کی ضرورت ہے۔ آج "علمِ دین" جن معلومات کا نام ہے میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ وہ اکثر صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کو آپ میں سے اکثر سے کم حاصل تھیں۔ انہیں جو علم بہ تمام و کمال حاصل تھا وہ "علمِ ایمان" تھا جیسا کہ ایک صحابیؓ فرماتے ہیں کہ تَعَلَّمۡنَا الۡاِیۡمَانَ ثُمَّ تَعَلَّمۡنَا الۡقُرۡاٰنَ "ہم نے ایمان پہلے سیکھا، قرآن بعد میں!"

منطقی طور پر بھی "دعوت الی اللہ" کا اصل لازمہ "ایمان باللہ" ہی کو ہونا چاہیے۔ چنانچہ جو آیت میں نے سنائی تھی اس سے متصلاً قبل ایمان باللہ کی بلند ترین منزل یعنی ربوبیّتِ خداوندی

---

[1] ترجمہ: "میں تم سے اس (دعوت) پر کوئی اجر نہیں مانگتا۔ میرا اجر تو بس اللہ کے ذمے ہے!"

پر دل کے جم اور ٹھک جانے اور اس پر استقامت حاصل ہونے ہی کا تذکرہ ہے کہ "اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا ...... الخ" دعوت الی اللہ کے منصب پر فائز وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو خدا کی ربوبیت پر پوری طرح مطمئن اور اس پر مضبوطی سے قائم ہوں۔

دوسری شرط: عمل صالح

'دعوت الی اللہ' کا دوسرا لازمہ یہ ہے کہ داعی کی عملی زندگی میں ایمان باللہ کے اثرات محسوس و مشہود ہوں اور وہ عمل صالح کا ایک حسین نمونہ ہو۔ چنانچہ اس آیت میں بھی "وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ" کے فوراً بعد 'وَعَمِلَ صَالِحًا' کا تذکرہ ہے۔ اس لیے کہ یہ دعوت کے مؤثر ہونے کی شرط لازم ہے! اس کے بغیر تعلیم و تدریس ہو سکتی ہے، اعلیٰ سطح کا علمی کام بھی کیا جا سکتا ہے اور اس میں شک نہیں کہ ان چیزوں کا اپنا ایک مقام اور ان کی اپنی ایک افادیت ہے لیکن 'دعوت' مؤثر صرف وہی ہو سکتی ہے جس کا شاہد 'عمل صالح' ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ 'عمل صالح' ہی وہ مشکل "گھاٹی" ہے[1] جس سے جی چرا کر ہم لوگوں نے یہ تقسیم کار کی ہے کہ کچھ لوگ اس کی قید سے آزاد ہوں اور حلال و حرام سب ذرائع سے دولت کما کر کچھ دوسرے لوگوں کو پالیں، جو دین کی تبلیغ کا کام کریں۔ ذہانت کا تو یہ یقیناً ایک شاہکار ہے! لیکن حقیقت یہ ہے کہ دین کے خلاف اس 'شریفانہ معاہدے' سے بڑی سازش شاید کوئی اور نہ ہو!

دعوت الی اللہ کا اصل ہدف

یہ آیہ کریمہ دعوت کے مطلوبہ عمل کے ایک اور پہلو کو بھی واضح کر رہی ہے اور وہ یہ کہ دعوت اللہ اور اس کے دین کی طرف ہونی چاہیے نہ کہ کسی خاص فرد، یا گروہ، یا جماعت یا فرقے یا مسلک و مشرب کی طرف۔ دعوت کا اصل ہدف یہ ہونا چاہیے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ اللہ کو پہچانیں، اس

---

[1] فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ ..... الخ (سورۃ البلد)

کی ربوبیت کا اقرار کریں اور اس پر پورے اطمینانِ قلب کے ساتھ یقین رکھیں، اسی کی اطاعت وبندگی کو اپنے اوپر لازم کریں اور اسی کی رضا جوئی کو اپنی زندگیوں کا نصب العین بنائیں اور اس کے لیے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے طریقے کو اختیار کریں۔ اس بات کو اس آیۂ کریمہ میں دو طرح واضح فرمایا گیا؛ ایک "مِمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ" کے الفاظ سے اشارہ کر دیا گیا کہ دعوت اللہ کی طرف ہو کسی خاص فرد یا جماعت کی طرف نہ ہو۔ اور دوسرے "وَقَالَ اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ" میں مزید وضاحت کر دی گئی کہ داعی خود بھی صرف مسلمان ہونے کا مدعی ہو اور کسی خاص گروہ یا فرقے کی جانب اپنے آپ کو منسوب نہ کرے اور اس کی دعوت بھی صرف 'اسلام' کی طرف ہو نہ کہ کسی خاص مسلک ومشرب کی طرف۔ اس لیے کہ اللہ کے نزدیک تو دین بس اسلام ہی ہے؛ (اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ)

تیسری شرط: تواضع اور انکساری

قرآن حکیم کا یہ اعجاز ہے کہ وہ مختصر ترین الفاظ میں وسیع ترین مفہوم کا بیان کر دیتا ہے۔ یہاں "اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ" میں ایک اور فتنے کی بیخ کنی بھی کر دی گئی ہے جس میں داعی کے مبتلا ہونے کا شدید خطرہ ہوتا ہے یعنی مقامِ دعوت پر فائز ہونے کا تکبّر، غرور اور گھمنڈ جس سے ایک طرف داعی خود راندۂ درگاہِ حق ہو جاتا ہے اور دوسری طرف اس کی دعوت کی تاثیر ختم ہو جاتی ہے۔ ان الفاظ میں ایک داعیٔ حق کے قلبی تذلّل وتواضع کی کیفیت کا نقشہ اس طرح کھینچا گیا کہ وہ یہ کہتا ہے کہ میں بھی بس ایک مسلمان ہی ہوں اور عام مسلمانوں سے کسی طرح بھی افضل یا اعلیٰ نہیں ہوں۔

۲ فتنوں کا سدِّباب

اس طرح "اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ" سے بیک وقت ایسے دو فتنوں کا سدّباب کر دیا

گیا جن میں عموماً اصحاب دعوت وعزیمت کے مبتلا ہونے کا خطرہ ہوتا ہے یعنی ایک یہ کہ ان کی دعوت اُمّت میں ایک نئے فرقے کی پیدائش کا سبب بن سکتی ہے جس سے افتراق و انتشار میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس کا سدّباب اس سے ہو جاتا ہے کہ داعی اور اس کے ساتھی یہ بات ہر وقت پیشِ نظر رکھیں کہ ہم بھی مسلمانوں ہی میں سے ہیں اور اُمّتِ مسلمہ ہی کا ایک جزو ہیں کوئی علیحدہ چیز نہیں! اور دوسرے یہ کہ داعی کی اپنی شخصیت ایک نیا بُت بن جائے جس کی پرستش شروع ہو جائے۔ اس فتنے کی ابتدا اصل میں داعی کی اپنی ذات سے ہوتی ہے یعنی پہلے خود اس کے اپنے دل و دماغ میں یہ خنّاس پیدا ہوتا ہے کہ میں "چیزے دگر" ہوں۔ داعی کے قلب کا یہ احساس اس کے قریبی ساتھیوں پر منعکس ہوتا ہے اور رفتہ رفتہ "پیراں نمے پرند و مریداں مے پرانند" کے مصداق داعی کی شخصیت لات و منات اور عُزّٰی و ہبل کی فہرست میں اضافے کا سبب بن جاتی ہے۔ اس کا سدّباب صرف اس طرح ہو سکتا ہے کہ داعی کے سامنے ہمیشہ یہ حقیقت عیاں رہے کہ "اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ" میں بھی بس ایک عام مسلمان ہوں اور اگر اللہ "وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ" کے مصداق حالتِ اسلام ہی میں اٹھا لے تو بس یہی میری سب سے بڑی کامیابی ہے!

سب سے اعلیٰ کام اور سب سے عمدہ بات!

"وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا" کے الفاظ پر بھی غور فرما لیجئے! ان الفاظ میں اس حقیقت کی جانب اشارہ ہے کہ یوں تو دنیا میں ہر صاحبِ صلاحیت آدمی کسی نہ کسی بات کی دعوت دیتا ہی ہے کوئی خاندان یا برادری کے مفادات کی پکار لگاتا ہے تو کوئی ملک و قوم کی عظمت کا راگ الاپتا ہے، کوئی جمہوریت کے قیام کی دعوت لے کر کھڑا ہوتا ہے تو کوئی اشتراکیت کے نفاذ کا داعی بنتا ہے لیکن ان سب سے بہت بلند، اعلیٰ اور ارفع دعوت اس کی ہے جو اللہ کے بندوں کو اللہ کی طرف پکارتا اور اس کے دین کی دعوت دیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس زمین کے اوپر اور اس آسمان کے نیچے انسان کے لیے اس مرتبے سے بلند تر کوئی مرتبہ نہیں کہ وہ "دَاعِیًا

اِلَی اللّٰہِ" اور "سِرَاجًا مُّنِیْرًا" صلی اللہ علیہ وسلم سے کسبِ نور کر کے خود بھی ہدایت کا ایک چھوٹا سا چراغ بن جاتے۔ "وَفِیْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ" (پس چاہیے کہ اسی کی حرص کریں حرص کرنیوالے!)

خلاصۂ کلام

اب تک جو کچھ عرض کیا گیا اس کا خلاصہ یہ ہے:

۱۔ اُمّتِ مسلمہ کی غرضِ تاسیس اور اس کا مقصدِ وجود ہی 'دعوت الی اللہ' ہے اور دنیا میں اس کی عزّت و سربلندی ہی نہیں بلکہ اس کے وجود و بقا کا تمام تر انحصار بھی اس پر ہے کہ وہ اپنے اس فرضِ منصبی کو کما حقہٗ ادا کرے۔

۲۔ پھر دعوت الی اللہ ہی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم (فداہ ابی و امّی) کی وہ سب سے زیادہ مؤکّد سنت ہے جس پر آپؐ کا تواترِ عمل ظاہر و باہر ہے۔ لہٰذا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کا اوّلین تقاضا بھی یہی ہے کہ آپ کی سنّتِ دعوت کا اتباع کیا جائے۔

۳۔ مختلف مذہبی جماعتوں اور فرقوں نے اپنے اپنے مسلک و مشرب کی اشاعت و توسیع کے لیے 'مبلغین' کی جو 'سول سروس' جاری کی ہوئی ہے وہ 'دعوت الی اللہ' کے نقطۂ نظر سے نہ صرف یہ کہ مفید نہیں ہے بلکہ الٹی مضر ہے!

۴۔ دعوت الی اللہ کے اصل لوازم ایمان اور عمل صالح ہیں نہ کہ فروعاتِ دین کا علم۔ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت پر یقینِ واثق اور اعمالِ صالحہ و اخلاقِ حسنہ کے امتزاجِ جمیل کے ساتھ یہ بھی لازم ہے کہ داعی میں تواضع و انکسار پایا جاتے اور اس کی دعوت بھی محض اللہ اور اس کے دین کی طرف ہو تاکہ نہ اس کی اپنی شخصیت ایک نیا بُت بن سکے اور نہ ہی اس کے حلقہ بگوش ایک نئے فرقے کی صورت اختیار کر سکیں۔

۵۔ 'دعوت الی اللہ' کے بہت سے پہلو اور بے شمار مدارج و مراتب ہیں۔ اور آج کی گفتگو کا اصل موضوع 'دعوت الی اللہ' کی وہ ابتدائی اور بنیادی منزلیں ہیں جن تک ہر باشعور مسلمان کی رسائی ممکن بھی ہے اور لازم بھی!

اُسوۂ حسنہ

اب میں آپ کی توجہ سیرتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے ان واقعات کی جانب مبذول کرانا چاہتا ہوں جو بعثت کے فوراً بعد پیش آئے تاکہ ایک طرف 'دعوت الی اللہ' کے اصل مبادی و اصول اور اس کا صحیح نہج و اسلوب واضح ہو جائے اور دوسری طرف یہ بات بھی واضح ہو جائے کہ خود آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دعوت کے ابتدائی دور میں وہ تمام مشکلات پیش آئیں اور اُن تمام دل شکنیوں کا سامنا کرنا پڑا جو کسی بھی دعوت کے ابتدائی ایام میں پیش آنی لازمی ہیں۔ اور آپ نے بعینہٖ انہی فطری طریقوں کو اختیار فرمایا جو کسی بھی شخص کو کسی دعوت کے پیش کرنے کے لیے لازماً اختیار کرنے پڑتے ہیں۔

آپ کو معلوم ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے کی زندگی بھی اخلاقِ حسنہ کا ایک کامل نمونہ تھی اور آپؐ کی سیرت و اخلاق پر کسی قسم کا کوئی داغ یا دھبّہ موجود نہ تھا۔ آپؐ نے اپنے حسنِ اخلاق اور راست معاملگی کی بدولت اپنے معاشرے سے 'الصّادق' اور 'الامین' کے خطابات حاصل کیے تھے۔ یہ واضح رہنا چاہیے کہ آپؐ نے یہ خطابات زندگی کی عین منجدھار میں رہتے ہوئے حاصل فرمائے تھے نہ کہ اس سے دُور کسی گوشۂ عافیت میں بیٹھ کر۔ آپؐ ہمیشہ اپنی سوسائٹی میں ایک فعّال فرد کی حیثیت سے شریک رہے۔ حتّٰی کہ آپؐ نے اس وقت کی اعلیٰ ترین سطح پر کاروبار بھی فرمایا اور حقیقت یہ ہے کہ دراصل اسی میدان میں آپؐ کی 'صداقت' اور 'امانت' کے اصل جوہر نمایاں ہوئے۔ بعد میں جب آپؐ 'دعوت الی اللہ' کے منصب پر فائز ہوئے تو اس وقت آپؐ کی دعوت کی تاثیر میں جہاں اس بات کو دخل ہے کہ خود وہ دعوت فطرتِ انسانی کے نہایت قریب اور عقلِ صحیح و طبعِ سلیم کی جانی پہچانی تھی وہاں اس امر کو بھی فیصلہ کن حد تک دخل حاصل ہے کہ اس کا پیش کرنے والا 'الصّادق' اور 'الامین' تھا صلی اللہ علیہ وسلم (روفداہ ابی و اُمّی!)

قربِ بعثت کے زمانے میں آپ پر تفکّر کا غلبہ ہو گیا اور رفتہ رفتہ "حاضر و موجود"[1] سے

---

[1] ہے وہی تیرے زمانے کا امامِ برحق   جو تجھے حاضر و موجود سے بیزار کرے   (اقبالؔ)

بیزاری اور حقیقتِ نفس الامری کی تلاش و جستجو کا جذبہ بڑھتا چلا گیا۔ چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ "ثُمَّ حُبِّبَ اِلَیْہِ الْخَلَاءُ فَکَانَ یَخْلُو بِغَارِ حِرَاءٍ فَیَتَحَنَّثُ فِیْہِ" کہ پھر آپؐ کو خلوت گزینی محبوب ہوگئی۔ چنانچہ آپؐ غارِ حرا میں خلوت گزیں ہوتے تھے اور وہاں عبادت فرماتے تھے۔ شروحِ حدیث میں اس عبادت کی نوعیت التفکّر والاعتبار یعنی غور و فکر اور عبرت پذیری بیان ہوئی ہے۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ سلسلہ کتنے عرصے چلا۔ بہرحال وہ وقت آگیا کہ "تلاشِ حقیقت میں سرگرداں" کو ہدایت نامہ حاصل ہوا[1]، وحی کا سلسلہ شروع ہوا، حقیقت پر سے پردے اُٹھا دیئے گئے۔ آپ کو منصبِ نبوّت عطا ہوا اور آپ "دعوت الی اللہ" کے علمبردار اور قرآن مجید کے الفاظ میں "شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا" بنا دیئے گئے۔ فصلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہ وصحبہ اجمعین۔

بعثت کے فوراً بعد دعوت کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ چنانچہ فطری طور پر سب سے پہلے ان قریب ترین لوگوں کو دعوت دی گئی جن کے ساتھ آپ کا اٹھنا بیٹھنا رہا تھا اور جو آپ کے اخلاق و عادات سے سب سے زیادہ واقف تھے یعنی زوجہ محترمہ حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضؓ، چچازاد بھائی جنہوں نے آپ ہی کے سایۂ عاطفت میں تربیت پائی تھی یعنی حضرت علیؓ، آزاد کردہ غلام حضرت زیدؓ اور جگری دوست حضرت صدیق اکبرؓ۔ چنانچہ یہ سب حضرات پہلے ہی دن ایمان لے آئے اور یہیں سے "دعوت الی اللہ" کا پہلا سبق واضح ہوا یعنی یہ کہ یہ گھر سے شروع ہوتی ہے اور اس کا اوّلین میدان انسان کے قریب ترین اعزّہ و اقارب ہیں یا عزیز ترین اصدقاء و احباب!

پھر ان "سابقون السّابقین" نے اتباعِ سُنّت کا جو مفہوم سمجھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّتِ دعوت کا جس طور سے اتباع کیا اس کی سب سے درخشاں مثال حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے قائم فرمائی کہ داعیِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع میں خود بھی فوری طور پر

---

[1] وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى (سورۃ والضحیٰ) ترجمہ "پایا تمہیں تلاش حق میں سرگرداں، تو ہدایت دی!"

داعی بن گئے اور یہ ان ہی کی دعوت و تبلیغ کا اثر تھا کہ 'سابقون الاوّلون' کے سرکردہ اور گلِ سرسبد عثمان غنیؓ، عبدالرحمٰنؓ ابن عوف، طلحہؓ، زبیرؓ، سعدؓ بن ابی وقاص، ابوعبیدہؓ ابن الجراح، عثمانؓ بن مظعون وغیرہم اللہ کے دین میں داخل اور اُمّتِ محمّدی میں شامل ہوئے، فجزاہ اللہ عن جمیع المسلمین والمسلمات خیر الجزاء۔ یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ محبتِ رسولؐ کا اصل تقاضا آپؐ کی سُنّتِ دعوت کا اتباع ہے۔ واضح رہے کہ حضرت ابوبکر صدّیقؓ کوئی زاویہ نشین یا گوشہ گیر انسان نہ تھے بلکہ معاشرے کے ایک متموّل، اور بااثر شخص اور ایک نہایت کامیاب تاجر تھے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے ہر شخص کے احسانات کا حساب چکا دیا سوائے ابوبکرؓ کے، ان کے احسانات کا بدلہ میں نہیں دے سکتا، اللہ ہی دے گا۔ واقعہ یہ ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے اپنی بالکل ابتدائی دَور کی دعوت و تبلیغ سے اُمّتِ محمّدیہ کو ان مایۂ ناز ہستیوں کا تحفہ دے کر جو احسان عظیم کیا ہے، پوری اُمّت اس کا بدلہ چکانے سے تاقیامت معذور رہے گی! یہ دعوت الی اللہ، کے "شجرہ طیبہ" کی ایک شاخ کا ذکر تھا جو تمام شاخوں میں سب سے بڑی تھی لیکن تنہا نہ تھی حقیقت یہ ہے کہ جو شخص بھی اس دعوت پر ایمان لایا وہ فوری طور پر خود بھی اس کا داعی بن گیا۔

"اصلِ ثابت" کی طرف رجوع کیجئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ملا: "وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَکَ الْاَقْرَبِیْنَ" اپنے قریبی عزیزوں کو خبردار کرو۔ سوچئے! آج بھی کسی کو حکم ہو کہ اپنے قریبی رشتہ داروں کو کوئی پیغام پہنچا دو تو وہ اس کے لیے سب سے اچھا طریقہ کون سا اختیار کرے گا؟ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پورے گھرانے یعنی بنوہاشم کی دعوت کا اہتمام فرمایا۔ چالیس کے لگ بھگ آدمیوں کو کھانا کھلانے کے بعد ان کے سامنے اپنی دعوت پیش کرنی چاہی، لیکن ابولہب کی بکواس نے اس کا موقع ہی نہ دیا اور مجلس ویسے ہی برخاست ہو گئی۔ سوچئے کتنی دل شکنی اور کیسی مایوسی کا سامنا حضورؐ کو ہوا ہو گا۔ لیکن 'داعی الی اللہ' کے لیے مایوسی کا کیا سوال، پھر اہتمام فرمایا۔ دوبارہ دعوت فرمائی اور پھر کھانا کھلایا۔ روایت ہے کہ بھرے مجمع میں سے صرف ایک نوجوان جسے نوجوان کے بجائے بھی بچہ ہی کہنا زیادہ مناسب ہے، ایسا نکلا جس نے ساتھ دینے کا وعدہ

کیا چشمِ تصوّر سے دیکھئے کہ اللہ کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم اپنے خاندان کو اللہ کی طرف بلاتا ہے۔ لیکن کوئی ایک متنفس بھی ٹس سے مَس نہیں ہوتا۔ حضرت علیؓ تو پہلے ہی سے اپنے تھے، ان دونوں دعوتوں کا حاصل تو صفر ہی رہا۔ ایسے ہی تو مواقع تھے جن پر وحیِ الٰہی تسلّی و تشفی کے لیے اترتی تھی کہ وَاصۡبِرۡ لِحُكۡمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعۡيُنِنَا[1] اور وَاصۡبِرۡ وَمَا صَبۡرُكَ إِلَّا بِاللّٰهِ[2]۔

حکم ہوا: "فَاصۡدَعۡ بِمَا تُؤۡمَرُ" جس بات کا تجھے حکم ملا ہے اسے برملا اور علی الاعلان کہہ! آپ نے وقت کے رواج اور دستور کے مطابق کوہِ صفا پر کھڑے ہو کر نعرہ لگایا "واصباحاہ" "لوگو! خطرہ درپیش ہے، فوراً جمع ہو جاؤ۔ جب لوگ جمع ہو گئے تو آپ نے پہاڑی کا وعظ، ارشاد فرمایا۔ ارشاد ہوا: "اے معشرِ قریش! اگر میں تم سے کہوں کہ پہاڑ کے عقب سے ایک لشکر آ رہا ہے تو تم کو یقین آئے گا؟" سب نے کہا "کیوں نہیں؟ جبکہ ہم نے آپ کو ہمیشہ سچ بولتے ہی دیکھا ہے!" تب آپ نے فرمایا: "تو میں یہ کہتا ہوں کہ اگر تم ایمان نہ لاؤ گے تو تم پر دردناک عذاب نازل ہوگا!" لوگ سخت برہم ہوتے اور کہتے ہیں کہ اسی موقع پر ابولہب نے کہا تھا "تَبًّا لَكَ، أَلِهٰذَا جَمَعۡتَنَا" "تیرے ہاتھ ٹوٹ جائیں، کیا بس اسی لیے تو نے ہمیں جمع کیا تھا" جس پر سورۃ اللّھب نازل ہوئی کہ ہاتھ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے نہیں بلکہ ابولہب کے ٹوٹ چکے! لیکن ابولہب کے ہاتھوں کا ٹوٹنا تو ابھی عالمِ امر میں تھا، عالمِ واقعہ میں تو اس کا ظہور تو بہت بعد میں ہوا۔ اس وقت جو صورت بالفعل موجود تھی وہ تو یہی تھی کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم گویا اندھوں اور بہروں کے سامنے اپنی دعوت پیش فرما رہے تھے جس کا قبول کرنے والا کوئی نہ تھا۔ پہاڑی کے اس وعظ کا تجزیہ کیجیے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس میں اصل دلیل داعی کی صداقت و امانت کا وہ عام اقرار ہے جو سوسائٹی میں موجود تھا اور مقامِ نبوّت کی وضاحت کے لیے موقع اور محل کے اعتبار سے بہترین تمثیل پیش کی گئی ہے کہ جیسے بلندی پر کھڑا ایک شخص دونوں طرف دیکھ رہا ہوتا ہے جبکہ پستی میں کھڑے لوگ دوسری طرف

---

[1] "اپنے پروردگار کے فیصلے کا انتظار کر۔ تو ہماری نگاہوں میں ہے"! (الطور: ۴۸)

[2] "اور صبر کر اور تیرا صبر اللہ ہی کے بھروسے پر ہے" (النحل: ۱۲۷)

کے حالات سے واقف نہیں ہوسکتے، اسی طرح نبی کی نگاہ میں دنیا و آخرت دونوں ہوتے ہیں جبکہ عام انسانوں کی نگاہیں دنیا کے بھی صرف ظاہر تک محدود ہوتی ہیں۔ یَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ۔[1]

اس طرح رفتہ رفتہ دعوت کا حلقہ وسیع ہوا، اللہ ہی جانتا ہے کہ ایسے کتنے اجتماعات کو آپؐ نے خطاب فرمایا۔ کتنے لوگوں سے ان کے گھروں میں جاکر ملاقات کی اور ان کے سامنے اپنی دعوت پیش کی۔ دُھن کا عالم یہ تھا کہ جب بھی معلوم ہوا کہ کوئی قافلہ باہر سے آیا ہوا ہے یا کوئی نووارد مکّے میں موجود ہے، آپ اس کے پاس پہنچ جاتے اور اپنی دعوت پیش فرماتے۔ اسی سے دعوت اور تعلیم و تدریس کا فرق واضح ہوتا ہے معلّم و مدرّس یوں دَر دَر کی ٹھوکریں نہیں کھاتے بلکہ وہ مطلوب و مرجع ہوتے ہیں اور طالبانِ علم ان کے پاس آتے اور ان کی نازبرداریاں کرتے ہیں جبکہ داعی طالب ہوتا ہے اور لوگ مطلوب۔ وہ گھر گھر جاتا ہے، ہر دروازے پر دستک دیتا ہے، ہر گوش تک اپنی آواز پہنچاتا ہے، لوگ تمسخر کرتے ہیں، تعذیب سے بھی نہیں چوکتے، جھٹلاتے اور دھتکارتے ہیں تو 'داعی الی اللہ' رات کے وقت اپنے ربّ کے حضور میں عاجزی و فروتنی کے ساتھ گڑگڑا گڑگڑا کر ان کی ہدایت کے لیے دعائیں کرتا ہے اور ایک ایک کا نام لے کر درخواست کرتا ہے کہ "باری تعالیٰ! عمر ابن الخطاب یا عمرو بن ہشام میں سے کوئی ایک تو مجھے ضرور ہی عطا فرمادے"! ایک طرف یہ اور دوسری طرف یہ بھی نگاہ میں رہے کہ "داعی الی اللہ" کے سینے میں پتھر کا ٹکڑا نہیں بلکہ ایک انتہائی حسّاس قلب ہوتا ہے جو ابنائے نوع کے کفر و انکار پر بری طرح تڑپتا ہے، ان کے انجامِ بد کے تصور سے اس پر غم و اندوہ کی جو حالت طاری ہوتی ہے اس سے اس پر عین عالمِ شباب میں بڑھاپے کے آثار طاری ہوجاتے ہیں اور وحیِ الٰہی کو بار بار تسلّی و تشفّی ہی نہیں محبت آمیز تنبیہہ بھی کرنی پڑتی ہے کہ لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا یَكُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ۔

---

[1] سورۃ الروم: "یہ لوگ واقف ہیں حیات دنیوی کے بھی بس ظاہر سے ہی اور آخرت سے تو پورے غافل ہیں ہی"!

اور لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا ۝ اے رسولؐ کیا تم ان کے کفر و انکار پر صدمے سے اپنے آپ کو ہلاک کر لو گے؛ ہم نے یہ قرآن تم پر اس لیے تو نہیں اتارا کہ تم ایسی سخت مشقت میں پڑ جاؤ۔ "طٰهٰ ۝ مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى ۝"

دعوت کے اساسی نکات

بات طویل ہو جائے گی۔ دعوت کے اس ابتدائی مرحلے کے بعد تعذیب و ابتلاء کا جو دور شروع ہوا اور جن صبر آزما اور جاں گسل حالات سے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے رفقائے کرام کو گزرنا پڑا وہ اپنی جگہ ایک مستقل موضوع ہے اور جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا میں اپنی آج کی گفتگو کو 'دعوت الی اللہ' کی صرف ابتدائی منزلوں تک محدود رکھنا چاہتا ہوں۔ البتہ اس گفتگو کو ختم کرنے سے قبل میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک خطبہ آپ کو ضرور سنانا چاہتا ہوں جو یقیناً اسی ابتدائی دور کا ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوگا کہ 'دعوت الی اللہ' کے اساسی و بنیادی نکات کیا ہیں اور اس میں اوّل اوّل کن امور پر زور دیا جاتا ہے۔ خطبات نبویؐ کی کتابوں میں یہ خطبہ ان الفاظ میں نقل ہوا ہے۔

اِنَّ الرَّائِدَ لَا يَكْذِبُ اَهْلَهٗ وَاللّٰهِ لَوْكَذَبْتُ النَّاسَ جَمِيْعًا مَّا كَذَبْتُكُمْ وَلَوْغَرَرْتُ النَّاسَ جَمِيْعًا مَّا غَرَرْتُكُمْ۔

"لوگو! تم جانتے ہو کہ رائد اپنے قافلے والوں کو کبھی دھوکا نہیں دیتا۔ خدا کی قسم اگر (بالفرض محال) میں تمام انسانوں سے جھوٹ کہہ سکتا تب بھی تم سے کبھی نہ کہتا اور اگر تمام انسانوں کو فریب دے سکتا تب بھی تمہیں کبھی نہ دیتا۔"

وَاللّٰهِ الَّذِىْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اِنِّىْ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ خَاصَّةً وَّاِلَى النَّاسِ كَافَّةً۔

"اس خدا کی قسم جس کے سوا کوئی الٰہ نہیں! میں اللہ کا رسول ہوں تمہاری طرف خصوصاً اور

پوری نوعِ انسانی کی طرف عموماً!"

وَاللّٰهِ لَتَمُوْتُنَّ كَمَا تَنَامُوْنَ. ثُمَّ لَتُبْعَثُنَّ كَمَا تَسْتَيْقِظُوْنَ ثُمَّ لَتُحَاسَبُنَّ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ثُمَّ لَتُجْزَوُنَّ بِالْإِحْسَانِ إِحْسَانًا وَّ بِالسُّوْءِ سُوْءً وَإِنَّهَا لَجَنَّةٌ أَبَدًا أَوْلَنَارٌ أَبَدًا.

"خدا کی قسم تم سب مرجاؤ گے جیسے (روزانہ) سو جاتے ہو! پھر یقیناً اٹھائے جاؤ گے جیسے (ہر صبح) بیدار ہو جاتے ہو پھر لازماً تمہارے اعمال کا حساب کتاب ہوگا اور پھر لازماً تمہیں بدلہ ملے گا اچھائی کا اچھا اور برائی کا برا۔ اور وہ جنّت ہے ہمیشہ کے لیے یا آگ ہے دائمی۔"

اپنے اس خطبے میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نبی کے لیے انتہائی بلیغ مثال رائد کی دی ہے۔ رائد کسی قافلے کا وہ معتمد ترین فرد ہوتا تھا جو سفر کی اگلی منزل کا تعیّن کرتا تھا اور قافلے سے آگے جا کر معلوم کرتا تھا کہ کس جگہ پڑاؤ مناسب رہے گا کہ پانی اور چارے کی سہولتیں فراہم ہوں ظاہر ہے کہ 'رائد' کے صدق و امانت پر ہی پورے قافلے کی سلامتی کا دارومدار تھا اور اس کی ذرا سی غلط بیانی پورے قافلے کی ہلاکت کا سبب بن سکتی تھی۔ یہی حال 'نبی' کا ہوتا ہے کہ وہ قافلۂ دنیا کو منزلِ آخرت کی خبر دیتا ہے اور یہاں کی مدہوشی و غفلت پر وہاں کے دردناک انجام سے خبردار کرتا ہے۔ اس انتہائی بلیغ پیرائے میں اپنے مقام و منصب کو واضح فرما کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم خدا کی توحید اور اپنی رسالت کی خبر دیتے ہیں اور پھر پورا زور اس بات پر صرف کر دیتے ہیں کہ غافلو ہوشیار ہو جاؤ نیند کے ماتو جاگو۔ جیسے روزانہ شام ہوتی ہے ایسے ہی تمہاری پوری زندگی کے دن پر بھی ایک شام آئے گی، اور جس طرح تم پر روز نیند طاری ہو جاتی ہے اسی طرح اس شام کو موت تمہیں اپنی آغوش میں لے لے گی پھر جس طرح تم روزانہ صبح بیدار ہو جاتے ہو اسی طرح ایک دن تمہیں موت کی نیند سے اٹھا لیا جائے گا۔ (وَذٰلِكَ يَوْمَئِذٍ يَّوْمٌ عَسِيْرٌ ۝ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ غَيْرُ يَسِيْرٍ ۝[1]) پھر تمہارے زندگی بھر کے اعمال کا حساب ہوگا اور پھر بدلہ مل کر رہے گا بھلائی کا بھلائی

---

[1] سورۃ المدثر: "پھر وہ دن بڑا ہی سخت دن ہے۔ منکروں پر ہرگز آسان نہیں!"

سے یعنی ہمیشہ کے لیے جنت اور بُرائی کا بُرائی سے یعنی ہمیشہ کی آگ۔ اس سے معلوم ہوا کہ دعوت الی اللہ کے بنیادی اور اساسی نکات تو تین ہی ہیں یعنی توحید، رسالت اور معاد لیکن ان میں بھی ابتداءً اصل زور آخرت کے محاسبے اور جزا و سزا سے خبردار کرنے پر ہونا چاہیے۔ پورا قرآن مجید اور خصوصاً ابتدائی مکیات اس پر شاہد عادل ہیں۔ اور دعوت کا جو پہلا حکم آنحضورؐ کو دیا گیا وہ تو اس پر آخری دلیل اور قطعی حجت ہے۔ ارشاد ہوا: یٰٓاَیُّھَا الْمُدَّثِّرُ۝ قُمْ فَاَنْذِرْ "اے کپڑے میں لپٹ کر لیٹنے والے! کھڑا ہو اور خبردار کر!" اور وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَكَ الْاَقْرَبِیْنَ "اور ڈرا اپنے قریبی رشتہ داروں کو"۔ دنیا میں نظامِ دین و شریعت کا نفاذ و قیام 'دعوت الی اللہ' کا ہدف تو یقیناً ہے لیکن اسے ہدفِ بعید کہنا چاہیے۔ اس کا اوّلین ہدف ابنائے نوع کی اُخروی فلاح و نجات ہے۔ چنانچہ ایک مقام پر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری اور تمہاری مثال ایسے ہے جیسے آگ کا ایک بڑا الاؤ ہے اور تم اس میں گر پڑنے کو تیار ہو اور میں تمہیں کمر سے پکڑ پکڑ کر اس میں گرنے سے روک رہا ہوں۔ پھر ظاہر ہے کہ جس سے جتنی زیادہ محبت ہو اتنا ہی وہ اس دعوت میں مقدم ہوگا یہی وجہ ہے کہ حضورؐ خاص اپنے گھرانے کے افراد کو لے کر بیٹھتے تھے اور فرماتے تھے" یا فاطمة بنت محمّد انقذی نفسكِ من النّار فانی لا املكُ لكِ من اللہِ شیئًا و یا صفیة عمة رسولُ اللہ انقذی نفسك من النار فانی لا املك لك من اللہِ شیئًا" اے فاطمہؓ، محمدؐ کی بیٹی' اور اے صفیہؓ اللہ کے رسول کی پھوپھی! خود اپنے آپ کو آگ سے بچانے کی فکر کرو۔ اس لیے کہ اللہ کے یہاں مجھے تمہارے بارے میں کوئی اختیار نہ ہوگا!

حضرات! یہ ہیں 'دعوت الی اللہ' کے اصول و مبادی اور یہ ہے اس کا اسلوب و منہج۔ مبارک ہیں وہ لوگ جو آج کی اس مجلس سے یہ فیصلہ کرکے اٹھیں کہ ہم ان اصولوں اور اس اسلوب پر 'دعوت الی اللہ' کا کام کریں گے اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی 'سنّتِ دعوت' کا اتباع کریں گے۔ میں نے اپنی اس گفتگو کو دعوت کے ابتدائی مراحل تک اس لیے محدود رکھا ہے کہ مجھے یقین ہے اور میں علیٰ وجہ البصیرت جانتا ہوں کہ اگر اس اسلوب پر 'دعوت الی اللہ' کے چھوٹے

چھوٹے چراغ اور ننھے ننھے دیے ہمارے شہروں بستیوں اور قصبوں میں روشن ہو گئے تو پھر اس دعوت کے اعلیٰ مقامات اور بلند تر منازل کا سامان بھی فراہم ہو جائے گا اور نہ صرف یہ کہ ایک ایسی اجتماعی قوت بہم پہنچ جائے گی جو اُمّتِ محمدیؐ کے جملہ اخلاقی و روحانی عوارض کا مداوا کرے اور "وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ط وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ o"[1] کی مصداق بن جائے۔ بلکہ وہ دن بھی دُور نہ رہے گا جب یہ اُمّت بحیثیتِ مجموعی 'دعوت الی اللہ' کے فریضے کو ادا کرے گی اور "كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ" کی صحیح معنیٰ میں مصداق ہو گی اور تمام نوعِ انسانی پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت کی جانب سے اتمامِ حجت کرے گی "لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ" اس کے برعکس اگر ترتیب یہ رہے کہ بلند بانگ دعاوی سے کام شروع کیا جائے اور پہلے ہی قدم پر عالمی انقلاب کا نعرہ لگایا جائے اور نجاتِ اُخروی کا بس تبرکاً تذکرہ کر کے قیامِ حکومتِ الٰہیہ اور نفاذِ نظامِ اسلامی کو اوّلین ہدف بنا کر جدوجہد شروع کی جائے تو لبسا اوقات چند ہی قدم چل کر انسان ہار جاتا ہے اور خود اپنی طے کردہ راہ کی کسی ادنیٰ سی چیز کو اپنا "عبوری نصب العین" قرار دے کر بس اسی کا ہو رہتا ہے۔

فنعوذ باللہ من ذٰلک! ــــ اقول قولی ھٰذا واستغفر اللہ لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

---

[1] سورہ آل عمران "اور چاہیے کہ رہے تم میں ایک جماعت ایسی جو بلاتی رہے نیک کام کی طرف اور حکم دے اچھے کاموں کا اور منع کرے بُرائی سے۔ اور وہی پہنچے اپنی مراد کو!"

مرکزی **انجمن خدّام القرآن** لاہور

کے قیام کا مقصد

منبعِ ایمان — اور — **سرچشمۂ یقین**

قرآنِ حکیم

کے **علم و حکمت** کی

وسیع پیمانے — اور — اعلیٰ علمی سطح

پر تشہیر و اشاعت ہے

تاکہ اُمّتِ مسلمہ کے فہیم عناصر میں **تجدیدِ ایمان** کی ایک عمومی تحریک برپا ہو جائے

اور اس طرح

اسلام کی نشأۃِ ثانیہ — اور — غلبۂ دینِ حق کے دورِ ثانی

کی راہ ہموار ہو سکے

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ